

حضرت امام الشاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک مجدد مصلح اور مفکر

حکیم الامت امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ گویا آخری بافتیا مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے ۴۷ سال قبل! آپ کے والد گرامی شاہ عبدالرحیم عالم باہمئل اور صوفی یا صفا تھے شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں میں ان کی حسن تربیت کا بڑا دخل ہے۔ جس کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی خودنوشت میں جایا کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب مغلوں میں سب سے زیادہ مذہب پرست بادشاہ تھا۔ لیکن یہ بات بھی شک برسر ہے بالآخر کہ جن انسانی خوبیوں کو مذہب مفید بتاتے وہ اب بالکل مفقود تھیں۔ حتیٰ کہ خود اورنگ زیب اہتبا تھا۔

راستی خدا ترسی، امانت داری اور اس طرح کے فضائل کیاب بلکہ نایاب ہیں۔

اس کی وجہ جو کچھ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شرع و فقہ کی گرم بازاری تو اس دور میں خوب تھی لیکن یہ باطنی برائیوں کا علاج نہیں۔ اس ذریعہ سے حدود و توقعات کا معاملہ تو خاتم ہو سکتا ہے۔ لیکن علاج دل کے لئے صاحب دل ہونا ضروری ہے۔ اور تزکیہ و احسان کی صفات عالیہ سے منصف ہونا لازمی ہے۔

اس ناسازگار ماحول میں شاہ صاحب پیدا ہوتے ہیں۔ دس مغل بادشاہ یا شطرنج کے پٹے اور بہرے ان کی زندگی میں اوپر تلے برسر افتخار آتے ہیں جن کے پاس علم و تقویٰ چھوڑ حکومت بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ ایران سے ہندوستان میں وارد ہونے والے شیعہ علما میں اپنی مخصوص فرہنیت کی بنا پر ہر طرف مسلط تھے اور بادشاہ عیسائیوں کا شہکاران کے ہاتھ میں کٹھ پتلی۔ اس منظر میں شاہ صاحب کے اصلاحی کام کی قیمت کا اندازہ لگانا آسان ہوگا۔

یہ صحیح کہ وہ پوری طرح حالات کا رخ نمودار کئے لیکن اس میں شک نہیں کہ سیاسی زوال کے باوجود انہوں نے قوم کے علمی سرہانے، اخلاق فضائل اور انسانی خوبیوں کو کسی درجہ میں محفوظ کر لیا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اب تک اس پورے خط میں اس حوالہ سے جو رونق ہے اس کے پس منظر میں شاہ صاحب کے انفس کی گرمی نظر آتی ہے شاہ صاحب کا سب سے بڑا احسان ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو قرآن فہمی کے ذوق سے سرفراز فرمایا

اور پھر ان کی اولاد اور آگے شکر ووں نے قرآن و سنت کے حقیقی سرچشموں سے ملت کو روحانی و دینی آبیاری کا سامان کیا۔ ورنہ اس دور میں کلامی مسائل کی گرم بازاری منطق و فلسفہ جیسے مضامین اور اس طرح کی باقی علمی خانوادہ کا سرمایہ فخر بنی ہوئی تھیں۔

شاہ صاحب نے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں اس طرح کیا کہ وہ حقیقی معنوں میں زندہ کتاب اس کے طور پر سامنے آگیا۔ فارسی اس دور کی دفتری و علمی زبان تھی۔ اسی وجہ سے شیعہ مائیدین اور علماء رسوم نیز صوفیان بے تحقیقت ان کے اور ان کی اولاد کے دشمن ہو گئے تھے کہ آئندہ چل کر ان کے عبقری اور ذہین پوتے۔

— شاہ محمد اسماعیل کے خلاف غیر آباد کے منطقی گھرانے کے سربراہ مولانا افضل حق نے جس طرح کی ہنگامی آرائی کی اس کے پس پشت منطق کی غسوس فہمیت، کلامی جھگڑے اور شاہ اسماعیل کا وہ ستھر ذوق دینی تھا جس کی بنیاد پر وہ "داعی الی اللہ" کا صحیح کردار ادا کر رہے تھے جب کہ مولانا افضل حق کا مشعل انگریز اور نوابان ریاست کی ملازمت، شطرنج کھیلنا اور منطق کے سبق پڑھانا تھا اور بس۔ پھر بھی کہ شاہ ولی اللہ اپنے عزیزوں میں حریت پسند گئے تھے۔ اور اب وہ شعلہ جوالہ بن کر جس گھر وندے کو جسم کرنے والی تھی۔ اس سے بھی بہی خواہان فریب کی البرجی بھی قدرتی بات تھی۔

امام ولی اللہ دہلوی نے قوم کی گجڑی ہوئی اخلاقی سکہ کو جس طرح سہارا دیا اور اس کے قوم کے اندر پھر جس طرح کی اخلاقی روح چھوڑی اس کے لئے تحریک مجاہدین سب سے بڑا ثبوت ہے۔ حضرت سید احمد نے اپنے رفقاء سمیت اپنے شیخ شاہ عبدالعزیز کی نگرانی میں تبلیغی دوروں اور سفر حج کے ذریعہ جو روح عمل و اخلاق بیدار کی اور جس طرح سنگلاخ وادیوں کو قطع کر کے بالاکوٹ کے دامن میں پہنچے۔ "ادول فاروان" کے مصداق اس کا اولین سہارا شاہ ولی اللہ کے سر ہے۔

تسلیم کہ بالاکوٹ ان حضرات کے خون سے رنگین ہوا۔ لیکن ان حضرات پر یہ تہمت تو ان کا کوئی بدترین دشمن بھی نہ لگا سکا۔ کہ وہ میدان چھوڑ گئے۔ ان ارباب عزیمت نے سرکھو دیا۔ بازی بارومی لیکن سرکھونا وہ کارناما ہے جس کی مثال نہیں۔ اور یہ کھوکھر چہ چراغ روشن کر گئے اس کا اندازہ کرنا تو مستقبل کی تاریخ سے کدو کر آئندہ کی ہر تحریک کا چراغ اس چراغ سے جل رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے توجہ جان مولانا عبداللہ سندھی کہتے ہیں :-

شاہ صاحب کی فکر میں آفاقی وسعت ہے۔ اس کا سبب مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ شاہ صاحب ایک طرف مسلمانوں کے علوم تعلیم کے وارث ہوتے تو دوسری طرف علوم عقاید سے بھی انہیں حصہ وافر ملا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ وہ منطلق کی قیل و قال کا شکار ہو کر رہ گئے۔

بلکہ انہوں نے خذما صفا و دوع ماکہ پر عمل کر کے دکھلایا۔ اور حضور خاتم المعصومین کے ارشاد و گرامی کی پیروی کی کہ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ وہ اسے جہاں سے ملے۔

حاصل کرے۔

شاہ صاحب کا دور ایسا تھا کہ یہاں کے مسلمان سستی اور خنی تھے۔ حکومتی دائروں میں اس سے انحراف گناہ سمجھی جاتا۔ ایران کے شیعہ اپنا رتبہ جارہے تھے۔ راجپوت سلطنت کے معاملات میں ذیل ہو کر سب و فلسفہ اور اس کے افکار سے دلچسپی لینے لگے تھے جتنی کہ یورپ کے مشنریز اس سرزمین تک پہنچ کر مشغول کار تھے۔ یہ متضاد اور منہجی انتہا شہ صاحب کے ماحول میں سرگرم عمل تھے۔ مناظروں اور مجادوں کا زور تھا لیکن شاہ صاحب نے ان تمام محروہ متہکمتوں سے الگ رہ کر فاعل علمی بنیادوں پر ملت کی تنظیم نو کا سر و سامان کیا۔ انہوں نے ایسا طریق اختیار کیا کہ مسلمان اپنے اعتقادات پر پوری طرح حجب رہے۔ اس میں کسی قسم کا احساس کمتری کا مرض پیدا نہ ہو۔ وہ اپنی روایات علمی و تاریخی کی صحیح امین و وارث بنے۔ اور "علی و ابی بصیرت" اس کو سینہ سے لگاتے لیکن کسی سے یہ نہ رکھے۔ بلکہ مذہبی وسعت قلبی سے کام لے کر اپنے پڑوسیوں اور ہم وطنوں سے مل جل کر رہے۔ کہ اس ذریعہ سے ان لوگوں کو اسلام کی بیکات کا قائل کرنا آسان ہے۔

شاہ صاحب نے اس ضمن میں جو کوششیں کیں ان میں سرفہرست قرآن کا اس وقت کی علمی زبان میں ترجمہ ہے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ انہوں نے مختصر حواشی بھی لکھے۔ اور جگہ بہ جگہ ان بنیادوں کو واضح کیا جو اسلامی سوسائٹی کی حقیقی بنیادیں ہیں۔ مثلاً سورہ الفتح کی آخری آیت میں محمد علیہ السلام کی رسالت کے ساتھ ان کے رفقاء کا ذکر کرتے ہوئے قرآن عزیز نے ان حضرات کو باجمہر مداح لیکن نندی بہت دھرم اور متعصب و انسانیت بیزار دشمنوں کے لئے ننگی تلوار اور سب سے کہا ہے۔ پھر ان کی ذاتی خوبی عبادت میں ان کا انہماک بتلایا۔ اور واضح کیا کہ یہ سب کچھ محض رضائے الہی کے لئے وہ کرتے ہیں۔ کوئی ذاتی غرض نہیں اور آخر میں واضح کیا کہ ابتداء میں یہ جماعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس ایک کوئیل کی طرح۔ لیکن ان خصال و فضائل کی بنیاد پر وہ بڑھتے جڑتے لہذا نئے حیرت میں تبدیل ہو گئی۔ جتنی کہ دشمنان صاحبہ لہلہا گئے۔ ان کے سینوں پر آریں چلنے لگیں۔ لیکن اس کھیتی کا دہقان خوش و خرم نظر آنے لگا۔

شاہ صاحب دہاتے ہیں کہ موجودہ مسلمان قوم کے پچھلے اور ابھرنے کا اب بھی یہی طریق ہے۔ کہ وہ رسالت مآب کو اپنے لئے مکرر تسلیم کر کے اس میں بھائی چارگی کا انداز اپنائیں۔ انسانیت سے بیر نہ رکھیں۔ ہاں جو بہت دھرم ان کے وجود کے درپے ہوں انہیں جس قدر قومی کا فاسد مادہ سمجھ کر تھس تھس کر دیں۔ اور اپنے ان اعمال حیات پر دنیا سے کسی قسم کے صدمہ کی امید رکھنے کے بجائے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعلیم کی روشنی میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں اور دنیا میں مساوت و برابری کے عادلانہ اصولوں کے مطابق زندگی گزاریں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ چاہتے ہیں کہ انسان میں قوتِ ملکوئی اس طرح غالب آجائے اور ظاہر ہے کہ اس کا ذریعہ اعتقادات و اخلاقِ فاضلہ ہیں کہ اس کے ذریعہ وہ بہیمی قوت پر غالب آجائے۔ اس ذریعہ سے انسان کو "نفسِ مطمئنہ" نصیب ہوتا ہے۔ اور یہی بات وراثتِ نبوت ہے۔ جس کا حدیث میں اس طرتِ ذکر ہے کہ ہم انبیاء و ربہم و ذرائعِ حق پر نظر نہیں جاتے۔ ہمارا سرمایہ تو بس علم ہے جس کو اس سے کوئی حصہ مل گیا وہ ہمارا ہو گیا۔ دوسری طرف انہوں نے تدلیسِ حدیث کو یہاں وسیع پیمانے پر رائج کیا۔ اور اپنی مجددانہ بصیرت سے بخاری تفریع کے بجائے مؤطا نام مالک کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کتاب میں اس سب سے نئی کے اعمال کا تذکرہ ہے جس میں کم سے کم اختلاف تھے۔ انہوں نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک اہل علم کے لئے عربی میں دوسری عام پڑھنے لکھنے حضرات کے لئے فارسی میں۔

تیسری طرف انہوں نے ایک مخصوص پیرایہ میں امت کی تاریخ مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا جس کا سب سے بڑا ثبوت چار ضخیم جلدوں میں ان کی کتاب "انزالہ الخفا" ہے۔ ایک عام سطح میں قسم کا انسان اس کتاب کو نصحابہ کے فضا کے و مناتب کی کتاب سمجھتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ کتاب اسلام کے اصولِ عدل کی ترجمان ہونے کے ساتھ اس کے قرنِ اول کے مثالی حکمرانوں کے اندازِ حکمرانی کی وضاحت کرنے والی ہے۔ ہماری تاریخ کا یہ ضمیمہ اسی دور سے بگڑتا ہے کیونکہ یہود اور عیسویں کی پیہم سازشوں سے اسلام کے سیدھے سادے اصولوں کے علی الرغم اس دور میں نیا فلسفہ "مشیعیت" کے نام سے مدون ہوا۔ اس فلسفہ میں قرآنِ عزیز کی تحریف و اولین معنایں قرآن کی تنقیص۔ بوقتِ نزول جھوٹ کی اجازت۔ اور امامت کے ایسے فکر کی نشان دہی ہے جس سے ختمِ نبوت کا مفہوم غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ ان مفاسد کا قلع قمع کرنا چاہا۔ اور مسلمانوں کو راہِ اعتدال دکھانے کے ساتھ ساتھ انہیں تاریخ کے اصول فراہم کئے۔

چوتھی طرف انہوں نے اپنے اور آنے والے دور کی "عقلیت پسندی کا توڑ کرنے کے لئے حجۃ اللہ الباقیہ نام کی کتاب لکھی جس میں اسلامی اصول و ارکان کی تعبیر و تشریح ایسے انداز سے کی کہ ایک عقل سلیم کا مالک انسان فوری طرح یہ حقیقت حال سے آگاہ ہو سکتا ہے بقول مولانا سبزواری

شاہ ولی اللہ کی حکمت کا خاص جوہر یہ ہے کہ وہ وحی سے حاصل شدہ دین اور عقل کی پیدا کردہ حکمت میں تضاد نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک انسان کے دماغ میں کوئی چیز باہر سے نہیں آتی۔ استدلال اور استنتاج کی دو دراز راہ سے انسان جن حقائق تک پہنچتا ہے وہ فلسفہ و حکمت ہے۔ نبی کے ذہن پر حقائق کا نزول براہِ راست ہوتا ہے لیکن عام انسان کا معاملہ ایسا نہیں اس لئے وحی عقل و حکمت کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں۔

اسی مفہوم کو آپ کے پوتے شاہ محمد اسماعیل شہید اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

انبیاء بشر نہ ولیکن نوع دیگر

آگے فرماتے ہیں کہ عام انسانوں کے کمالات کی جہان تکمیل ہوتی ہے وہاں سے انبیاء علیہ السلام کے کمالات کی ابتدا ہوتی ہے۔

اسی کتاب میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ اقتصادی اور معاشی مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر کچھ کہنے سے قبل ہم اس طرٹ جی توب دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے امت کے تاریخی تسلسل کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ کیونکہ اس میں ہی امت کی جماعت کا راز ہے خاص طور پر بزرگ پاک و ہند کے حوالہ سے تو مولانا عبید اللہ سندھی کے بقول انہوں نے سیرت مجدد الف ثانی کے چھوڑے ہوئے کام کو پکڑا اور آگے بڑھایا۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسئلہ میں حضرت مجدد اور شیخ ابن عربی کے درمیان اپنا سہر جو اختلاف کی خلیج نظر آتی ہے۔ اپنے جیکھا نہ انداز سے اس کو پائنا چاہا۔ اور اس میں فاسمی تعداد تک کامیابی ہوئی جس کا اندازہ اس فن میں ان کے علوم کے وارث ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کی کتابوں سے ہو سکتا ہے۔

مولانا سندھی مزید کہتے ہیں کہ

ہندوستان کا ایک دور تیمورنگ سے لے کر اورنگ زیب تک ختم ہوتا ہے جس کے خاتم حضرت مجدد الف ثانی ہیں۔ تو دوسرے دور کے فاتح شاہ ولی اللہ۔ اور ظاہر ہے کہ غاتم اور فاتح میں مماثلت اور اشتراک ضروری ہے اسی طرح یہ بات جبری دلچسپی کی ہے کہ بعض لوگ دور حاکم کی اصطلاحات سے مرعوب ہو کر شاہ صاحب کو ایک انقلابی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ وہ مجدد اور مسیح تھے نہ کہ انقلابی۔ اس دقیق فرق کی مولانا سندھی اس طرح واضح کرتے ہیں:-

شاہ صاحب ان معنوں میں انقلابی نہ تھے کہ وہ پہلی سوسائٹی کو ختم کر کے اس کی جگہ بالکل ایک نئی سوسائٹی میں پیدا ہوئے۔ گو اس میں زوال شروع ہو چکا تھا اور وہ بہت سی خفیاں قبول کر چکی تھیں لیکن جس اساس پر وہ قائم تھی وہ ابھی بالکل کھوکھلی اور فرسودہ نہ ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس اساس کی اصلاح کی دعوت دی (اور یہی پیغمبرانہ طریق ہے) اور اس میں جو غلط باتیں داخل ہو گئی تھیں ان کی نفی کی۔ چنانچہ جب وہ انہی کتابوں میں اس سوسائٹی اور اس کے مختلف طبقات کو مخاطب کرتے ہیں تو اپنی بات سمجھانے کے لئے اس سوسائٹی کے مسلمات اور علوم متعارفہ کو دیل اور مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مخاطبین ان باتوں پر یقین رکھتے تھے اور ان باتوں کو

مثال کے طور پر پیش کرنے سے اصل مقصد کی طرف آسان سے بلایا جاسکتا تھا۔

اس بات کو اصول فقہ کی زبان میں "عرف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم یہی ہے کہ کسی سوسائٹی اور قوم میں اگر کوئی اچھی چیز موجود ہے اور اسلام کے مسلمات سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا تو اسے چھیڑا نہ جائے۔ ورنہ معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی۔ قرآن عزیز میں عرف، معروف اور اس قسم کے الفاظ بکثرت آئے ہیں اور ان کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اتھرنے اس ضمن میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا ہے جو "منہاج" کے مصداق شریعت غیر میں منقریب چھپ کر آنے والا ہے۔ اسلام کے اس اصول عرف کو سمجھ اور پہچان لیا جائے تو کسی سوسائٹی کی اصلاح بہت آسان ہو جاتی ہے۔ ورنہ بگاڑ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے معاشی مسائل کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا جیسا کہ ابتداء میں اشارہ ہوا۔ لوگ یہ سنیں کہ ایک حکیم مسلح، بخدا اور داعی الی اللہ ان زینوی بکھیر دے گا کیا لینا چاہتا ہے۔ ہل میں لوگوں نے سمجھا ہی نہیں کہ معاش کا مسئلہ کتنا اہم ہے؟ لوگوں کے خیال میں چند وقت کی نماز، مہینہ کے روزے اور ایسے ہی چند اعمال کا نام دین ہے اخلاق خالص، رزق حلال، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، اور اس قسم کی باتوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔

آج خود ہمارے ملک میں انسان کے بنیادی حقوق بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔ انسان کو نہ تو روٹی میسر ہے نہ کپڑا۔ اس کی عزت محفوظ ہے نہ جان۔ اسے علاج، معالجہ، تعلیم کی سہولتیں میسر نہیں۔ ایک خاص طبقہ تو وافر طریق سے مال و سبب دنیا ہوتے رہا ہے۔ لیکن عام انسانی آبادی ان نعمتوں سے محروم ہے۔

نام نہاد اہل علم کا ایک طبقہ اس قسم کے معیش پسند منشیات کی سرپرستی کرتا ہے اور اس کے علم میں اس طبقہ کی پانچوں انگلیاں گھٹی میں رہتی ہیں۔ لیکن دکھی انسانیت کی کوئی فکر نہیں کرتا۔ ہماری اس خطرناک غفلت کے نتیجے میں آج پورا ملک عیسائی مشنری کی زد میں ہے۔ ان کے سپینال تعلیمی ادارے اور اس قسم کے دوسرے ادارے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے نتیجے میں حضور اکرم علیہ السلام کا وہ ارشاد سناٹے آ رہا ہے کہ کاوا الفقرا ان یکون کفا۔

ہمارے یہاں کمیونزم اور سوشلزم کے خلاف لٹھی بمباری تو بہت ہے۔ لیکن یہ "فٹے علمیا" جن اسباب کے تحت پروان چڑھ رہا ہے۔ ان کی کسی کو فکر نہیں۔ شاہ صاحب نے اس فائر و فلسفہ کے بانی و موجد کارل مارکس کی پیدائش سے صدی بھر قبل خفہ بخت ہندی مسلمانوں کو توجہ دلائی۔ لیکن آج پوری دنیا میں دولت اور وسائل رزق میں چند خاندانوں کی اجارہ داری ہے اور بس۔

شاہ صاحب سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معاشی پالیسی کے زبردست مداح ہیں اور اس کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر شخص کے لئے برابر کا روزینہ مقرر کیا۔ اور جب بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ افراد ایسے ہیں جو اسلام کے اعتبار سے مقدم ہیں جنہیں ہجرت و جہاد کی سعادتی حاصل ہیں اس لئے

ان کی خدمات دینی کے سبب ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔ اس پر سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہاں سے ثواب و اجر ملے گا۔ دنیا کا معاملہ ہر شخص کا یکساں ہے۔

لیکن ہم نے عجیب حال کیا کہ بعض لوگوں کے جوتوں پر سفیدی اور چمک نظر آتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں کے چہرے کھلے رہتے ہیں۔ شاہ صاحب اس فکر پر سخت تنقید کرتے ہیں وہ قیصر و کسریٰ کی سوسائٹیوں کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے حجتہ اللہ میں فرماتے ہیں:-

واضح رہے کہ جب ایرینیوں اور رومیوں کو اپنی بین الاقوامی حکومتیں چلاتے صدیوں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی کا اصل اور بنیاد بنا لیا۔ اور یہ بھلا بیٹھے کہ مگر پھر زندہ ہونا ہے۔ اور کسی اعلیٰ طاقت کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔ اولاً ان پر ان کے شیطان نفیس غالب آ گئے۔ انہوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ عیش پرستی میں مزید انہماک سے سوچتے کہ اس سلسلے کو کس طرح مزید بڑھایا جائے اور پھر ان اعمال پر اترتے۔ سختی کہ دنیا کے نام نہاد و مکار۔ و عقلاً بکار خویش دیوانہ ہشتیا کے مصداق ان کی کمزوری محسوس کر کے ان کے درباروں میں جمع ہونے لگے۔ یہ لوگ ان کی عیاشی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ ان سرمایہ داروں کا یہ حال ہو گیا کہ ان میں سے جس کے پاس ایک لاکھ روپے سے کم کی چوٹی ہوتی اسے بھینسی کا عار دلایا جاتا۔ ایسے پر انہوں نے سرفراہی و پلانیے اور محلات و عمارت، پائیں باغ، حمام بنانے شروع کر دیے۔ بیش قیمت سواری کے جانور اور اس انداز کی چیزوں کا اہتمام مقصد زندگی ٹھہرا لیا۔ لباس فاخرہ اور انواع و اقسام کے کھانے کے بغیر ان کا گزرنہ ہوتا۔

شاہ صاحب نے پھر اپنی سوسائٹی کی مثال پیش کی۔ کہ آج دہلی کے ملوک و امرا اور ان کے درباری علماء صاحب زادوں، بشہزادوں۔ بے تنگ و نام صوفیوں، مشاعروں اور زر پرستوں کو دیکھ لو۔ تو بعینہ اسی سوسائٹی کا نقشہ نظر آئے گا۔

یہی حال اب یہاں ہے۔ جب یہ حال ہو جاتا ہے تو پھر خزانہ اور عیبیں خالی نظر آنے لگتی ہیں تاں کہ ان نام نہاد ضروریات کے لئے حکومت آئے دن ٹیکسز کا دھندا بڑھاتی ہے۔ حتیٰ کہ عام آدمی فلم کی چکی میں پس کر رہ جاتا ہے۔ عوام غریب کو لہو کے پیل کی مانند سارا دن اور ساری رات کام دھندا کرتے ہیں۔ لیکن اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ کہ حکومت کے ظالمانہ ٹیکسز کا ان پر شدید بوجھ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں

کے فقدان میں تزلزل آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کی کیفیت بے یقینی کا شکار ہوتی ہے۔ اسلام کے ابدی اصول بے وقعت ہونے لگتے ہیں۔ اور انسانی معاشرت بے راہ روی کا شکار ہونے لگتی ہے۔ جو لوگ دنیا کی اس ذرق برق کیفیت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن صحیح طریق سے حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ چوری، ڈاکہ زنی اور اس قسم کے جرائم پر اتر آتے ہیں۔ اور کچھ لوگ علم و معرفت، شاعری اور ایسے ہر حوالوں سے بے کار محض بن کر درباروں اور حکومتوں سے دولت اینٹھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

الغرض عقائد، اخلاق، اعمال سب بگڑتے ہیں اور انسان جو انسانیت کی سطح پر اتر آتا ہے۔ کچھ کھاتے پیتے جانور کچھ خالی پیٹے جانور جو آخر کو حکم انسلاد بے رحمی والوں کی نذر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بقول شاہ صاحب کسی سوسائٹی کا یہ حال ہو جائے تو اس پر برہادی مسلط ہو جاتی ہے۔ وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ ایران و روم کی سوسائٹیاں اس وجہ سے بریا و سہو ہیں کہ ان میں بے انصافی، ظلم اور زیادتی کا دور دورہ ہو گیا۔ اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز سے پوچھا گیا کہ آپ کہتے ہیں کہ یہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ نہ رہے گی تو فرمایا، اہل کبتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کیوں؟ تو فرمایا اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی نوع کا ظلم پسند نہیں۔ یہ سوسائٹی ظلم کا شکار ہے اس لئے بچ نہیں سکتی۔

الغرض شاہ صاحب کے محاسن گنوانے کا تو کوئی فائدہ نہیں کہ یہ بیکار اور بے روزگاری سے عاری قوموں کا شہرہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے بڑوں کے گیت گا کر جینے کی فکر کرتی ہے۔ اور ضرورت اس کی ہے کہ اس سسٹم ایام میں سلیم بنی شکیں دیکھیں اور اصلاح کی فکر کریں۔

بقیہ دارالعلوم دیوبند۔

ابھی تین سال پہلے دارالعلوم دیوبند نے اپنا جشن صد سالہ منایا تھا۔ جس میں تمام عالم اسلام کی برگزیدہ شخصیات کے علاوہ وزراء، سفراء، ارباب حکومت اور علمی اداروں کے سربراہ تو شریک ہوئے ہی تھے۔ عوام الناس اور دیہات و قصبات کے لوگوں کا اتنا بڑا مجمع تھا کہ بیستم فلک نے کسی در سے کے اعزاز میں محبت اور اخلاص کا یہ منظر شہر یدہ بھی دیکھا ہو۔ ایک اندازے کے مطابق اس جشن میں ۱۵ لاکھ سے زیادہ انسانوں نے شرکت کی تھی اس سے آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو مسلمانان عالم کے دلوں میں کیا مقام حاصل ہے۔ ہندوستان کو اس پر فخر ہے کہ عالم اسلام کی اتنی بڑی درس گاہ اس ملک کے ایک چھوٹے سے قصبے کا نام ساری دنیا میں روشن کرتے ہوئے ہے۔